داعی الی اللہ کے لیے احسن قول، احسن عمل اور صبر کی ضرورت

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء بمقام مسجد احمدیہ مارٹن روڈ کراچی)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۶﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۴-۳۶)

اور پھر فرمایا:

میں نے گزشتہ تین خطبات میں جماعت کو داعی الی اللہ بننے کی طرف توجہ دلائی تھی اور یہ آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں داعی الی اللہ بننے کے لئے جس رنگ میں قرآن کریم نے مومن کو توجہ دلائی ہے اس پر کچھ روشنی ڈالی تھی اور پھر وہ پس منظر بھی بیان کیا تھا جو ان آیات سے پہلے خود قرآن کریم داعیان الی اللہ کا بیان کرتا ہے کہ وہ تمدنی، معاشرتی اور دینی لحاظ سے کیسے لوگ ہوتے ہیں، وہ کیا کام شروع کرتے ہیں، ان کا مدعا کیا ہوتا ہے، دنیا ان سے کیا سلوک کرتی ہے، پھر

اس سلوک کے بعد اللہ ان سے کیا سلوک کرتا ہے اور ایسے ہر قسم کے حالات سے دوچار ہو کر اور ان میں سے گزرنے کے بعد پھر وہ پہلے سے زیادہ داعی الی اللہ بن کر ابھرتے ہیں۔ یہ وہ مضمون تھا جو میں نے قرآن کریم کی روشنی میں بیان کیا تھا اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس مضمون کا آغاز صرف ذاتی اور انفرادی ایمان سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کہ وہ لوگ جو خود اپنی ذات کے لئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے لیکن اس اعلان کے بعد جب ان کو مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو پھر وہ اس اعلان سے پیچھے ہٹنے کی بجائے داعی الی اللہ بن جاتے ہیں۔ یعنی دوسروں کو بھی بلانے لگتے ہیں کہ تم بھی اسی رب کی طرف آجاؤ جو ہمارا رب ہے۔

یہ وہ مضمون ہے جو میں نے گذشتہ تین خطبات میں بیان کیا تھا۔ اب اس اعلان کے بعد پیدا ہونے والے نتائج سے متعلق کچھ کہوں گا۔

قرآن کریم داعی الی اللہ کو اس کے مستقبل کے حالات سے بھی باخبر رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں (یہ موقع ہو یا کوئی اور موقع ہو) جہاں حکم کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالی ذمہ داریوں سے آگاہ نہ کیا گیا ہو، اس کے اچھے اثرات سے آگاہ نہ کیا گیا ہو، اس کے خطرات سے آگاہ نہ کیا گیا ہو، اور پھر خطرات سے بچنے کا طریق نہ سکھایا گیا ہو۔ پس وہ آیات جو یہاں سے شروع ہوتی ہیں وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ان میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔

سب سے پہلی بات جو توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ میں ''لا'' کی تکرار کیوں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ جہاں بھی حسنہ اور سیئہ کا موازنہ کیا گیا ہے اور یہ کہنا مقصود ہے کہ بھلائی بدی کے برابر نہیں ہوسکتی اور بدی بھلائی کے برابر نہیں ہوسکتی وہاں ایک ہی ''لا'' نے دونوں کام کئے ہیں اور عربی قاعدہ کے مطابق موازنہ کے لئے دو دفعہ ''لا'' کی تکرار نہیں ہونی چاہئے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ بدی اور بھلائی ہم پلہ یعنی برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک دفعہ ''نہیں'' کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ نہ بدی برابر ہوسکتی ہے نہ بھلائی برابر ہوسکتی ہے۔ پس یہ وہ مضمون ہے جس کو اردو میں اس کا متبادل مضمون بیان کر کے واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ عربی میں اس طرح کی تکرار کا ترجمہ یہ بنے گا کہ نہ بدی برابر ہوسکتی ہے نہ بھلائی برابر ہوسکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں حکمت کیا ہے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ یَسْتَوِیْ تَسْتَوِیْ کا محاورہ بعض دفعہ مقابلہ کے لئے آتا ہے، بعض دفعہ بغیر مقابلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ محاورہ ایک جماعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور شخص واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس میں مقابلہ یا موازنہ مقصود نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے متعلق قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الاعراف: ۵۵) پھر وہ عرش پر استویٰ پکڑ گیا۔ اور بھی کئی جگہ انہی معنوں میں استوی، یستوی کا استعمال ہوا ہے جن میں مقابلہ مقصود ہی نہیں اور اس کے معنی کچھ اور بن جاتے ہیں۔

پس لاتستوی الحسنة بھی اپنی ذات میں ایک مکمل اعلان ہے اور لا تستوی السیئة بھی اپنی ذات میں ایک مکمل اعلان ہے جیسا کہ فرمایا وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ دراصل یہاں دو الگ الگ اعلان ہو رہے ہیں اس لئے یہاں عربی لغت کے مطابق استویٰ کا معنی یہ بنے گا کہ نہ تو نیکی کو قرار ہے نہ بدی کو قرار ہے۔ دونوں اپنی ذات میں Stable یعنی مستحکم نہیں ہیں۔ یہ بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہر وقت ایک مقابلہ جاری ہے۔ مثلاً وہ نیکی جس کی تم حفاظت نہ کرو اور جس کو بڑھانے کی کوشش نہ کرو اس کے متعلق اگر تم یہ خیال کرو کہ یہ استویٰ کر رہی ہے یعنی وہ اپنے مقام پر ٹھہری رہے گی اور اس کا نقصان نہیں ہوگا تو یہ غلط فہمی ہے، اس کو دل سے نکال دو۔ اسی طرح یہ خیال بھی دل سے نکال دو کہ بدی اگر تمہاری طاقت سے کمزور پڑ گئی ہے تو وہ دوبارہ سر نہیں اٹھا سکتی۔ قانون قدرت ایسا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک مجادلہ، ایک جہاد ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ نہ تو حسن کو قرار ہے نہ بدصورتی کو قرار ہے نہ خوبی کو قرار ہے نہ بدی کو قرار ہے۔

یہ وہ مضمون ہے جو قرآن کریم بیان کرنا چاہتا ہے اور چونکہ جہاد کا مضمون چل رہا ہے اس لئے اس موزونیت سے یہی مضمون ہونا چاہئے۔ چنانچہ معاً بعد صرف جہاد کی طرف لوٹتا ہے۔ فرماتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اب تمہارا مقابلہ ہوگا۔ جب تم دنیا کو نیک کاموں کی طرف بلاؤ گے تو تمہارا مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ یاد رکھو یہ مقابلہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم جب تک جہاد میں مصروف رہو گے تمہارا حسن بھی بڑھتا چلا جائے گا اور مقابل کی بدیاں گھٹتی چلی جائیں گی۔ جب تم جہاد سے غافل ہو جاؤ گے تو تمہارے اندرونی حسن کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کیونکہ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔

پھر قانون کیا ہوا۔ فرمایا اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ جب بھی مقابلہ ہو تو یہ بات یاد رکھنا کہ بدی کے مقابل پر صرف حسن پیش نہیں کرنا بلکہ بہترین حسن پیش کرنا ہے۔ ایسا حسن کہ جس سے بہتر اور حسین تصور ممکن نہ ہو۔ وہ بات نکالو جو بہترین ہو اور اس سے بدی کا مقابلہ کرو۔

یہ جو احسن دلیل کے ساتھ مدمقابل سے مجادلہ کا سوال ہے یہ بھی دو طرح سے جاری ہوتا ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں اس سے پہلے داعی الی اللہ کے متعلق فرمایا کہ وہ بلاتا بھی ہے اور نیک عمل بھی کرتا ہے۔ پس اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا اطلاق بلانے کی طرف بھی ہوگا اور نیک اعمال کی طرف بھی ہوگا۔ گویا ان معنوں میں یہ بات بنے گی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جب تمہارا دوسروں کے ساتھ قول میں مقابلہ ہو تو احسن قول سامنے پیش کرو، جب تمہارا اعمال میں مقابلہ ہو تو احسن عمل مقابل پر پیش کرو۔

جہاں تک احسن قول کا تعلق ہے، پھر آگے اس کی شاخیں بنتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک دشمن گالیاں دیتا ہے، بدزبانی سے کام لیتا ہے تو اس موقع پر یہ آیت یہ تعلیم دے رہی ہے کہ اس کے مقابل پر تم نے بدزبانی نہیں کرنی، تم نے گندہ دہنی سے کام نہیں لینا کیونکہ اس لڑائی کے جو اسلوب مسلمان کو بتائے جارہے ہیں ان میں یہ بات داخل ہی نہیں کہ برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ اگر تم اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہو جو ان آیات کے آخر پر بیان ہوا ہے تو پھر تمہیں اس اسلوب جنگ کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جہاں تم اس کو چھوڑ دو گے تو پھر نتائج کے ذمہ دار تم ہو گے۔ پھر نہ قرآن ذمہ دار ہے نہ وہ ذمہ دار ہے جس نے قرآن کریم کو نازل فرمایا۔

پس احسن قول میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر قسم کی گندہ دہنی، گالی گلوچ اور ایذا رسانی کے مقابل پر اچھی بات کہنا سیکھو۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

؎ گالیاں سن کے دعا دیتا ہوں ان لوگوں کو
رحم ہے جوش میں اور غیظ گھٹایا ہم نے

(آئینہ کمالات اسلام روحانی خزائن جلد نمبر ۵ صفحہ ۲۲۵)

یہ ہے قول میں بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا ایک عملی نمونہ۔

اس کا دوسرا پہلو مجادلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب دلائل کی جنگ شروع ہو تو پہلے کمزور دلائل

نہ نکالا کرو یا یوں ہی کوئی دلیل دینی نہ شروع کر دیا کرو بلکہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی رو سے تم اپنے ترکش سے سب سے اچھا تیر نکالو، سب سے مضبوط دلیل نکالا کرو اور یہ ایک بہت بڑی حکمت کی بات ہے۔ بعض دفعہ لوگ کسی مضمون کے بارہ میں ایک سے زائد دلائل سیکھ جاتے ہیں اور پھر اس بات کا امتیاز کئے بغیر کہ وہ کس دلیل کو زیادہ عمدگی سے پیش کر سکتے ہیں ایک، دو، تین گنتی بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ ہر ہتھیار کو ہر شخص پوری مہارت سے استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر ہتھیار اچھا بھی ہو تب بھی اس کے استعمال کرنے کا ڈھنگ تو آنا چاہئے۔ بعض قوموں نے ہتھیاروں میں بالادستی کے باوجود بعض دفعہ عبرتناک شکستیں کھائی ہیں کیونکہ ان کو ہتھیار کا استعمال نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کی مصر اسرائیل جنگ میں رشیا کی طرف سے مصریوں کو بڑے (Sophisticated Weapons) عمدہ اور ترقی یافتہ ہتھیار دیئے گئے تھے لیکن مصریوں کو ابھی ان کا استعمال کرنا نہیں آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے ان ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور پھر ان کو مصریوں کے خلاف استعمال کیا۔

پس احسن دلیل سے صرف یہ مراد نہیں کہ دلیل فی ذاتہٖ مضبوط ہو بلکہ اس کو پیش کرنے کا ڈھنگ بھی احسن ہو اور اس پر پوری طرح عبور بھی حاصل ہو۔ اس پہلو سے جب ہم تربیتی کلاسز منعقد کرتے ہیں تو ہمیں حکمت کے اس نکتے سے اس موقعہ پر بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کوئی بھی طالب علم جس کو ایسی کلاسوں میں جانے کا تھوڑا سا وقت ملتا ہے، اس کو بجائے اس کے زیادہ سے زیادہ دلائل سمجھائے جائیں جن سے فائدہ کی بجائے آہستہ آہستہ ذہن Confuse یعنی خلط مبحث پیدا ہو جائے، کوشش کی جائے کہ قرآنی تعلیم کے مطابق ایک چوٹی کی دلیل چنی جائے جو اس کو یاد کروائی جائے۔ اس میں اسے صیقل کیا جائے اس کے سارے پہلو ذہن میں اجاگر کئے جائیں تا کہ وہ اسے زیادہ عمدگی کے ساتھ استعمال کر سکے اور پھر اس دلیل پر جو حملہ ہوتا ہے اس کا جواب بھی تفصیل سے سمجھایا جائے۔ گویا ایک دلیل کو لے کر اس پر پوری مہارت پیدا کر دی جائے تو یہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کے حکم کی اطاعت ہوگی۔

چنانچہ باہر کے ملکوں میں بعض مبلغین نے یہ تجربہ کر کے دیکھا ہے اور بڑا کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ایک افریقن مبلغ نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ اس نے اپنے ایسے افریقن نومسلموں کو جن کو عام تعلیم بھی نہیں آتی تھی، ان کو بائیبل میں سے ایک دلیل سکھا دی اور ان سے بار بار سنکر اتنی پختہ کروا دی

کہ پورا یقین ہو گیا کہ اب وہ اس ہتھیار کو استعمال کرنے کے ماہر ہو گئے ہیں۔ پھر اس دلیل پر جو عیسائی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں وہ بھی بتا دیں اور بڑی آسانی کے ساتھ یہ کام ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دندناتے پھرتے تھے۔ جہاں کوئی عیسائی مجمع ہوتا تھا وہاں پہنچ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں زیادہ دلیلیں تو نہیں آتیں ایک دلیل آتی ہے اس کو توڑ کر دکھا دو۔ جب تم اس کو توڑ کر دکھا دو گے تو پھر ہم دوسری دلیل لے آئیں گے لیکن جب تک اس کو نہیں توڑو گے ہم آگے نہیں چلیں گے۔ اس ترکیب سے انہوں نے اردگرد کے تمام عیسائی منادوں کو مصیبت ڈال دی۔ ان کا بیان ہے کہ حقیقتاً ان منادوں کو وہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔

غرض اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کے تابع ہر احمدی جو داعی الی اللہ بننا چاہتا ہے اس کو پہلے تمام اختلافی مسائل کی کوئی ایک دلیل چن لینی چاہئے۔ لیکن وہ دلیل چننی چاہئے جس پر وہ ذہنی اور علمی لحاظ سے خوب عبور حاصل کر سکتا ہو اور شروع میں اپنے علم کو بہت زیادہ نہ پھیلائے۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو سب سے قوی دلیل وفات مسیح کی ہے۔ سب سے عمدہ تشریح قرآن کریم کی آیت خاتم النبیین کی ہے اور اسی طرح دیگر مسائل مثلاً صداقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر ایک ایک دلیل کو چنیں اور اس پر عبور حاصل کریں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا تیسرا پہلو یہ ہو کہ جب مناظرہ شروع ہو، گفتگو شروع ہو تو تمہارا یہ کام نہیں ہے اور تمہاری گفتگو کا یہ مقصد نہیں ہے کہ تم دوسرے کو نیچا دکھاؤ اور اس کی تذلیل کرو کیونکہ قول کا حسن جاذبیت کے معنی رکھتا ہے اس لیے تم جس بات کو پیش کرو اسے اس طرح پیش کرو کہ لوگوں میں اس کے لئے کشش پیدا ہو نہ کہ نفرت میں اور بھی انگیخت ہو جائے۔ پس یہ پہلو بھی قول کے حسن کے ساتھ بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ احسن کہہ کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہاری گفتگو کا طریق نہایت عمدہ ہونا چاہئے۔ ایسی گفتگو کریں جس میں تقویٰ ہو، سچائی ہو، گہرائی ہو اور وزن ہو۔ لوگوں کو صداقت از خود جھلکتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔ دیکھنے والے عش عش کر اٹھیں اور بے اختیار کہنے لگیں کہ یہ تو سچائی بول رہی ہے اور وہ ان کو قبول حق پر مجبور کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بہت سے صحابہ کم علمی کے باوجود اس لئے کامیاب مبلغ تھے کہ ان کی بات میں وزن تھا، ان کے اندر سچائی تھی، ان میں سادگی تھی اور سادگی بجائے خود ایک قوت تھی۔ ان چیزوں نے مل کر ان کی زبان میں اور ان کے

قول میں ایک حسن پیدا کر دیا تھا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا جو نتیجہ قرآن کریم بعد میں ذکر کرتا ہے وہ نتیجہ ان کو حاصل ہوا۔

داعی الی اللہ کا دوسرا پہلو اعمال کو حسین بنانے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ دو باتیں بیان فرمائی تھیں۔ ایک یہ کہ مومن داعی الی اللہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عَمِلَ صَالِحًا یعنی وہ نیک اعمال بھی بجالاتا ہے۔ گویا نیک اعمال کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ وہ احسن بن جائیں۔ یہاں نیک اعمال بمقابلہ بداعمال مراد ہیں۔ یہ ایک مقابلہ کی صورت ہے جو یہاں پیش کی گئی ہے۔ مثلاً لوگ مال لوٹتے ہیں، گھر جلاتے ہیں، طرح طرح کے دکھ دیتے ہیں اسکے باوجود اپنے دل کو اس بات پر آمادہ رکھنا اور اس کی ایسی تربیت کرنا کہ خود دشمن جب دکھ میں مبتلا ہو تو اس کی مدد کی جائے گویا اعمال کے لحاظ سے یہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی ایک بہترین صورت ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ نے ہمیشہ اس بات پر بڑی سختی سے عمل کیا اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ احمدیت کے شدید دشمن کو آپ نے تکلیف میں دیکھا ہو اور اس کی مدد نہ کی ہو۔ وہ احراری جو قادیان میں بستے تھے جب بھی ان کو کسی چیز کی ضرورت پیش آتی تھی آپؓ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ بیماری میں ان کی مدد کیا کرتے تھے، مصائب میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ غرض جب بھی اور جہاں سے بھی ان کو اطلاع ملتی تھی کہ کوئی دشمن کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو آپؓ ہمیشہ اس کے ساتھ حسن سلوک فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے جبکہ بیماری میں ایک دفعہ آپؓ مری میں مقیم تھے وہاں آپ کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب بہت بیمار ہیں اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ آپؓ سخت بے قرار ہو گئے۔ آپؓ نے ڈاکٹر حشمت اللہ خاں صاحب سے کہا کہ آپ جا کر وہاں دیکھیں اور ان کا پورا علاج کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا کہ حضور خود بیمار ہیں، میں وہاں کیسے چلا جاؤں۔ آپؓ نے فرمایا بالکل نہیں۔ میں آپ کی ڈیوٹی لگاتا ہوں آپ جائیں اور مولانا ظفر علی خاں صاحب کا علاج کریں۔ ان کو محض نسخہ لکھ کر نہیں دینا بلکہ دوائیں بھی مہیا کرنی ہیں اس لئے جس قسم کی دوائی کی بھی ان کو ضرورت ہے اس کے پیسے مجھ سے لے لیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور ضرورت بھی ہے تو وہ بھی پوری کرنی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر حشمت اللہ خاں صاحب نے اس حکم کی اطاعت میں یہی کیا اور مولانا ظفر علی خاں صاحب کی آخری بیماری کے ایام میں جبکہ وہ مری میں قیام پذیر تھے اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ

کے امام کو یہ توفیق بخشی کہ ان کی دیکھ بھال کریں۔ قطع نظر اس بات کے کہ ان کے دل پر اس کا کیا اثر پڑا اور انہوں نے اس کا اظہار کن الفاظ میں کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کچھ بھی ردعمل ہوتا تب بھی مومن اس جادہ سے ہٹ نہیں سکتا، اس راہ کو چھوڑ کر وہ اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ قرآن کریم نے اس کو پابند کر دیا ہے کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی رو سے تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم برائی کا بدلہ بہر حال نیکی سے دو گے۔ کوئی مصیبت میں مبتلا ہے اس کی مصیبت کو دور کرنے کے لئے تیار رہو گے اور اپنے عمل سے ہرگز یہ ثابت نہیں کرو گے کہ تم بھی بروں کی طرح برے ہو جاتے ہو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا دوسرا پہلو اندرونی تربیت سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا جب بھی تمہارے اندر کوئی برائی پیدا ہونے لگے تو اس کو حسن سے دور کرو اور جب بھی معاشرہ میں تربیت کے معاملہ میں کوئی برائی پیدا ہو اس کو بھی حسن سے دور کرو۔

یہ مضمون بھی اپنی ذات میں بڑا گہرا اور تفصیلی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں بھی Annihilism یعنی ملیا میٹ کر دینے کا کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ قرآن کریم نے کہیں بھی کسی کو یہ تعلیم نہیں دی کہ وہ کسی موجود چیز کو مٹا دے۔ ہاں بہتر چیز سے بدلہ دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن سارے قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی Annihilism یعنی ملیا میٹ کر دینے کی تعلیم نہیں دی گئی۔

یہ کہنا کہ:

؎ اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

(بال جبریل نظم بعنوان فرمان خدا)

قرآن کریم میں ایسی کوئی تعلیم نہیں ملتی۔ یہ شاعروں کی دنیا کی باتیں ہے۔ قرآن کریم یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر تم میں بہتر چیز دینے کی طاقت موجود ہے تو بری چیز کو بہتر چیز سے تبدیل کرو۔ اگر تم میں یہ طاقت موجود نہیں ہے تو پھر تمہیں اس بات کا کوئی حق نہیں کہ ایک موجود چیز کو مٹاؤ کیونکہ اس طرح خلا پیدا ہوتا ہے جس کی سارے قرآن میں کوئی تعلیم نہیں ہے۔

پس اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا یہاں مطلب یہ بنے گا کہ برائیوں کو حسن سے Replace

یعنی بدل دو۔ حسن داخل کرتے چلے جاؤ تا کہ برائیاں جگہ چھوڑتی چلی جائیں۔ جیسے ایک کمرہ میں زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہ ہو تو جو لوگ پہلے بیٹھے ہوتے ہیں وہ نئے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی اسی قسم کا مضمون ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اپنی طبیعت میں حسن داخل کرتے چلے جاؤ، بدیاں خود بخود جگہ چھوڑتی چلی جائیں گی اور یہ امر واقعہ ہے کہ اس کے بغیر کبھی دنیا میں کوئی باقی رہنے والی تربیت نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اس نفسیاتی نکتے کو نہیں سمجھتے وہ ہمیشہ بدیاں دور کرنے میں ناکام رہتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جب کسی کو یہ کہا جائے کہ یہ نہ کرو تو سوال یہ ہے کہ کیوں نہ کرے، اس سے بہتر کوئی چیز ملے گی تو نہیں کرے گا ورنہ وہ اپنی ضد پر قائم رہے گا۔ فطرت چاہتی ہے کوئی اس کا متبادل ہو، کوئی اس سے بہتر چیز ہو اس لئے میں نے بارہا یہ کہا ہے کہ آپ جب اپنے گھروں کی، اپنے بچوں کی، اپنی عورتوں کی تربیت کرتے ہیں تو اس بات کو پیشِ نظر رکھا کریں کہ اگر ان کو میوزک سے ہٹانا ہے یا گندی قسم کے گیتوں سے اور گندے فلمی گانوں سے ہٹانا ہے تو پہلے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظمیں اچھی آواز میں تیار کریں جو دل پر گہرا اثر کرنے والی ہیں۔ جب آپ وہ نظمیں ان کو سنانا شروع کریں گے تو آہستہ آہستہ ان کی لذتوں کے معیار بدلنے شروع ہوں گے۔ ایک چیز داخل ہوگی دوسری کو دھکیل کر باہر کر رہی ہوگی۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے، دو دن کا کام نہیں ہے، یہ تو بڑا لمبا اور صبر آزما کام ہے۔ ہمت کے ساتھ اور مستقل مزاجی کے ساتھ انسان اگر ایک پروگرام بنا کر رفتہ رفتہ یہ کام کرنا چاہے تو یقیناً کامیاب ہوگا کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے اور قرآن کریم کا دعویٰ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں آپ کو تربیت کے کام کی تیاری کے لئے بہت وسیع مضمون مل جاتا ہے۔ مثلاً احادیث نبویہ ہیں، ان میں سے ایسی احادیث منتخب کریں جو غیر معمولی طور پر دل پر اثر کرنے والی ہوں وہ احسن کے تابع آئیں گی۔ آنحضرت ﷺ کی طرف سے آپؐ ہی کے الفاظ میں احکامات دینا بھی بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔ ایسی احادیث کے ترجمے کرنا یا مختلف معاشرتی خرابیوں کے پیش نظر احادیث میں سے انتخاب کرنا بہت ضروری ہے۔ پھر آپ ان کو ریکارڈ کریں یا مجالس میں بیان کریں۔ گھروں میں چھوٹی چھوٹی مجلسیں لگیں وہاں اچھی تلاوت سنائی جائے اور پھر اس کے ترجمے ہوں۔ قرآن کریم تو ایک ایسی کتاب ہے جو آہستہ آہستہ سارے انسانی نظام Take Over کرتی یعنی اس پر قابض ہو

جاتی ہے۔ قرآن کا حکم چلنے لگ جاتا ہے اور غیر قرآن کا حکم خود بخود جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ پس یہ درجہ بدرجہ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی مثالیں ہیں۔ آپ Creative Programme یعنی تعمیری پروگرام بنائیں۔ یاد رکھیں اگر آپ میں تعمیری پروگرام بنانے کی اہلیت نہیں ہے تو دنیا آپ کی بات نہیں مانے گی۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ان کے دستور سے جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل میں وہ اس بات کا انتظار نہیں کیا کرتے تھے کہ مقابل کی سوسائٹی پہلے ایمان لائے تو پھر ان کے اندر حسن عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کی جائے۔ قرآن کریم میں ایسے جتنے بھی واقعات بیان ہوئے ہیں ان سے پتہ لگتا ہے کہ برائیوں کو دور کرنے کی تعلیم وہ پہلے شروع کر دیتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اس بات کا کب انتظار کیا تھا کہ قوم ایمان لائے تو میں ان کو کہوں کہ تول درست کرو۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کی بداخلاقی کی اصلاح کے لئے کب یہ انتظار کیا تھا کہ قوم ایمان لائے تو پھر میں ان کی تربیت کا کام شروع کروں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے وہ کیا باتیں کی تھیں جن کے نتیجہ میں یہ اعتراض پیدا ہوئے کہ تم ہمارے اموال میں دخل دے رہے ہو اور تم ہمارے اوپر اپنی حاکمیت جتا رہے ہو اور ہمیں نصیحتیں کر رہے ہو۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء نے قوم کے عمل کو درست کرنے کے لئے کبھی اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ وہ لوگ ایمان لاتے ہیں یا نہیں۔

اس میں ایک گہری حکمت ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ نیکی کی بات دراصل کسی دلیل کو نہیں چاہتی کسی اچھے اور خوبصورت کام کی طرف اگر آپ خوبصورت رنگ میں کسی کو بلاتے ہیں تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کب تمہیں مانتے ہیں کہ تم ہمیں یہ باتیں کہتے ہو۔ اگر کوئی یہ جواب دے تو اس کی بڑی بیوقوفی ہوگی۔ آپ کسی بھوکے آدمی کو یہ کہیں کہ میں تمہارے لئے کھانا لایا ہوں تم کھانا کھالو تو وہ یہ نہیں پوچھے گا کہ میں تو تمہیں مانتا ہی نہیں، میں کیوں کھانا کھالوں۔ کوئی آدمی گرمی میں دھوپ میں بیٹھا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ اٹھ کر سایہ میں آجاؤ تو وہ آگے سے یہ جواب نہیں دے گا کہ نہیں! نہیں! تم اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہو میں اور فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ اچھی باتوں میں فرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نظریاتی اختلاف الگ ہیں ان کا اپنا مقام ہے اور نیک اعمال کی تعلیم ایک بالکل الگ مسئلہ ہے اس لئے اس معاملہ میں انبیاء نے کبھی انتظار نہیں کیا اور اس میں ایک بڑی حکمت یہ تھی کہ ان کا اور

سوسائٹی کا فاصلہ زیادہ نہیں ہوا۔ اگر آپ اپنے ماحول کو گندہ ہونے دیں اور اجازت دے دیں کہ وہ جو رخ چاہتا ہے اختیار کر لے اور انتظار کریں کہ جب تک وہ قبول نہیں کرتا اس وقت تک آپ نے ان کے اندر حسن پیدا نہیں کرنا تو آپ میں اور اس ماحول میں جتنے فاصلے بڑھتے چلے جائیں گے اتنے آپ کے مسائل بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ بے اعتنائی واپس الٹتی ہے اور یہی گندہ ماحول پھر آپ کے گھر کو تباہ کرتا ہے۔ یہ ایسی بے اعتنائی نہیں ہے جس کو خدا بخش دے گا بلکہ بے اعتنائی کرنے والی قوم کو اس بے اعتنائی کی سزا دی جاتی ہے کیونکہ مخالف معاشرہ بدیوں میں جتنا آگے بڑھتا ہے وہ ساتھ ساتھ آپ سے اپنا ٹیکس وصول کرتا ہے اور آپ کے معیار کو بھی کھینچ کر نیچے لے جا رہا ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم نے انبیاء کا جو پاک نمونہ محفوظ کیا ہے اس کا یہی مقصد تھا کہ جو قومیں بھی داعی الی اللہ بننا چاہتی ہیں وہ اپنے معاشرہ کی درستی کا انتظام اس بات کا انتظار کئے بغیر شروع کر دیں کہ وہ لوگ ایمان لاتے ہیں یا نہیں۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کے نتیجہ میں انسان کو دکھ ملتے ہیں۔ قرآن کریم نے عجیب نتیجہ نکالا ہے۔ لیکن قرآن کریم جب یہ نتیجہ نکالتا ہے اور اس طرف توجہ دلاتا ہے تو پہلے اس طریق کار کے عظیم الشان پھل کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اگر تم اس طریق پر کاربند ہو جاؤ، اس طریق پر گامزن ہو جاؤ تو ہم تمہیں ایک ضمانت دیتے ہیں اور وہ یہ ہے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۵﴾ کہ وہ جو پہلے تمہاری جان کا دشمن تھا وہ تمہارا جاں نثار دوست بن جائے گا اور یہی وہ اعلیٰ مقصود ہے جس کو ایک داعی الی اللہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی کامیابی کا نشان یا تمغہ ہے جو اسے عطا ہوگا۔ نفرتیں محبتوں میں تبدیل کی جائیں گی، جان کے دشمن جانثار دوستوں میں تبدیل کئے جائیں گے اور یہ ساتھ ہی ایک کسوٹی بھی ہے یعنی اگر تبلیغ کے نتیجہ میں یہ واقعات رونما نہیں ہوتے تو اس تبلیغ میں کوئی خرابی ہے۔ اگر کسی تبلیغ کے نتیجہ میں ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں تو یقیناً یہی وہ صحیح طریق ہے جس پر تبلیغ کی جا رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی توجہ دلائی کہ یہ ایسا آسان کام نہیں ہے کہ ادھر تم منہ سے اچھی باتیں نکالو تو اچانک وہ لوگ تمہارے دوست بن جائیں گے۔ ویسے اچانک کا لفظ موجود ہے۔ فَاِذَا الَّذِیْ میں اچانک پن پایا جاتا ہے لیکن اس کا معنی اور ہے، وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔

غرض یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ادھر تم نے منہ سے بات نکالی اور ادھر وہ تمہارے دوست بن

گئے کیونکہ اچانک پن کا صبر سے کوئی جوڑ نہیں یعنی اس اچانک پن کا کہ ادھر تم نے کام شروع کیا ادھر نتیجہ نکل آیا اس کا صبر سے کیا تعلق ہے۔ مگر قرآن کریم معاً بعد فرماتا ہے۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اس نتیجہ کو صبر کرنے والوں کے سوا کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر اچانک پن کا کیا مطلب ہے اور صبر کا مضمون کیا ہے؟ اب اس کو میں کھولوں گا تو بات سمجھ آجائے گی۔

بات یہ ہے کہ ہر نصیحت کا رستہ ایک صبر آزما مشکل کا رستہ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کو بلاتا ہے تو اس کے دو طریق ہیں۔ یا تو اس شخص کے ساتھ آپ کی دوستی ہے اور یا دشمنی ہے۔ اگر دوستی ہے تو زیادہ نصیحت کرنے کے نتیجہ میں دوستیاں بھی ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ آپ اپنے دوستوں کو بار بار نصیحت کر کے دیکھیں تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنا شروع کر دیں گے، کیا تم نے کان کھانے شروع کر دیئے ہیں یار چھوڑو بھی، اب بس بھی کرو۔ پھر زیادہ سختی کرنی شروع کریں گے تو وہ کہیں گے بند کرو یہ کیا رٹ لگائی ہوئی ہے۔ پھر کہیں گے جاؤ جہنم میں ہمارا دین الگ ہے تمہارا الگ ہے۔ ہم جو چاہیں کریں تم کون ہوتے ہو ہمیں نصیحتیں کرنے والے۔

پس تجربہ کر کے دیکھ لیں اس طرح بظاہر الٹ نتیجہ نکلتا ہے یعنی آپ جتنی نصیحت کرتے ہیں اتنی دشمنیاں بڑھتی ہیں اور پھر انبیاء کے زمانہ میں تو یہ بہت شدت اختیار کر جاتی ہیں کیونکہ باوجود دوستی کے نصیحت کا مضمون بہت بلند ہو جاتا اور جس چیز کی طرف بلایا جاتا ہے وہ اتنی مختلف ہوتی ہے اس چیز سے جس پر وہ قومیں پائی جاتی ہیں کہ اس فاصلہ کے نتیجہ میں بھی بڑی شدت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب دیکھئے آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ محبت کا پیغام لائے ہیں، سب سے زیادہ احسن قول آپؐ کا قول تھا، سب سے زیادہ احسن عمل آپؐ کا عمل تھا، اس کے باوجود سب سے زیادہ مخالفت آپؐ سے کی گئی۔ تو پھر فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ کا کیا مطلب ہوا؟ اس مضمون کو صبر نے کھولا ہے۔ فرمایا شروع میں ایسا ہی ہوگا جب تم نیک کاموں کی طرف بلانا شروع کرو گے تو شروع میں قوم کا اسی قسم کا ردعمل ہوگا۔ تمہاری محبتوں کے نتیجہ میں شدید نفرتیں پیدا ہوں گی لیکن اگر تم متزلزل نہ ہوئے، اگر تم اپنی محبت پر قائم رہے، اگر اپنے قول اور فعل کے حسن پر قائم رہے تو پھر اس صبر کے نتیجہ میں اِذَا الَّذِيْ والا واقعہ رونما ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو تمہیں یوں لگے گا جیسے اچانک ہو گیا ہے۔ حالانکہ صبر اندر ہی اندر مخالفتوں کو کھا جایا کرتا ہے۔ صبر میں بڑی قوت ہے۔ یہ

عجیب بات ہے کہ صبر کرنے والے کی دعائیں اور کوششیں جب پھل لاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے اچانک پھل لگ گیا ہے۔ اس تاثر کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ دوسرے اِذَا الَّذِیْ میں ایک اور مضمون بھی ہے۔ اِذَا الَّذِیْ اچانک پن کے علاوہ ایک غیر معمولی واقعہ کی تحسین کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ دیکھو دیکھو کیسا شاندار نتیجہ نکلنے والا ہے۔ ان معنوں میں بھی اِذَا الَّذِیْ استعمال ہوتا ہے۔ تو دوسرے معنی اس کے یہ بنیں گے کہ دیکھو ان کوششوں کا کیسا عظیم الشان نتیجہ نکلا ہے۔ ہم جو تمہیں کہتے تھے کہ یوں کرو تو یونہی نہیں کہتے تھے یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کرنیوالا مضمون تھا۔ فرمایا فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ دیکھنا کتنا عظیم الشان انقلاب برپا ہو گیا کہ تمہارے خون کے دشمن جاں نثار دوست بن گئے۔

میں اس وقت چند ایک باتیں صبر کے مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صبر دونوں جگہ ہے یعنی قول میں بھی اور عمل میں بھی۔ جو بات کہنے کی ہے وہ کہتے چلے جانا ہے۔ یہ ہے قول کا صبر اور جو حسن عمل ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ آزمائش جتنی مرضی سخت ہوتی چلی جائے تم نے اپنے اعمال کے حسن کو بدی میں نہیں تبدیل ہونے دینا۔ یہ دو قسم کے صبر تمہیں اختیار کرنے پڑیں گے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا چند اشارے کرتے ہوئے میں آگے چلتا ہوں۔ اس مضمون کو جب آپ کھولیں گے تو بہت سی کام کی باتیں اور بڑی حکمت کی باتیں آپ کے ہاتھ میں آئیں گی۔

دوسرے صبر کا مضمون یہ بتاتا ہے کہ تم تو محبت کر رہے ہو گے وہ تمہیں دکھ دے رہے ہوں گے اور اس دکھ کے نتیجہ میں تمہارے اندر کوئی ایسی قوت پیدا ہونی چاہئے جس سے تمہیں وہ غلبہ نصیب ہو گا جس کی طرف ہم تمہیں بلا رہے ہیں یا جس کا ہم تم سے وعدہ کر رہے ہیں۔

صبر کس قوت میں ڈھلا کرتا ہے؟ یہ اصل سوال ہے۔ اگر صبر سچا ہے اور وہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہو کہ وہ اپنے نفس کی خاطر کسی کی بھلائی نہیں کر رہا بلکہ دوسرے کی بھلائی کی خاطر وہ کر رہا ہے اور جس کے لئے کوئی کام کر رہا ہو اس کے لئے رحم کا اور شفقت کا اور محبت کا حقیقی تعلق ہو تو پھر جب وہ دوسرا انکار کرتا ہے تو صبر ہمیشہ اس کے لئے دعا میں تبدیل ہوا کرتا ہے، غصہ میں تبدیل نہیں ہوا کرتا۔ ماں جب بیٹے کو نصیحت کرتی ہے اور وہ ضد کرتا ہے اور کہنا نہیں مانتا تو کوئی جاہل ماں ہو گی جو اس پر لعنت ڈالنا شروع کر دے ورنہ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ مائیں پھر روتی ہیں، اپنی جان ہلکان کر رہی

ہوتی ہیں، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کرتی ہیں اور دوسرے لوگوں کو دعا کے لئے خط لکھتی ہیں کہ میرا بچہ تباہ ہو رہا ہے دعا کریں نیک بن جائے۔

پس صبر سے جو عظیم الشان قوت پیدا ہوتی ہے وہ دعا کی قوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم محض اپنی باتوں پر اور نیک اعمال پر انحصار نہ کرنا۔ جب ان باتوں پر صبر کرو گے پھر بھی تمہیں دکھ دیئے جائیں گے اور صبر لازماً دعاؤں میں ڈھلے گا اور وہ دعائیں عظیم الشان نتیجہ پیدا کریں گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ جو فرمایا ہے کہ عرب کے بیابان میں جو ایک ماجرا گزرا کہ صدیوں کے مردے زندہ ہو گئے اور پشتوں کے بگڑے الٰہی رنگ پکڑ گئے جانتے ہو وہ کیا تھا وہ ایک فانی فی اللہ کی دعائیں ہی تو تھیں۔ (برکات الدعا روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۱) ایسی دعائیں صبر کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ بے صبر تو اپنے دل کی بات غصہ کے ذریعہ نکال لیتا ہے، اس کے آنسو کہاں سے نکلیں گے جو گالی کے ذریعہ جواب دے کر اپنا دل ٹھنڈا کر بیٹھا ہو، سامنے بات کرنے سے ڈرتا ہو تو پیچھے گھر میں آ کر ہزار بڑبڑ کرے کہ یہ بکواس اس نے کی، یہ کیا اور وہ کیا، تو اس بیچارے کو کہاں سے توفیق ملنی ہے کہ رات کو اٹھ کر روئے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ صرف خدا کی خاطر مجھے مار پڑی ہے، صرف خدا کی خاطر مجھے تکلیف دی گئی ہے اور خاموش رہتا ہے اور اپنی توجہ کو اپنے رب کی طرف پھیرتا ہے کہ اے اللہ! میں تیری خاطر مارا گیا، میں تیری خاطر ذلیل ہوا مگر میں صبر کرتا ہوں، تب اندر ہی اندر اس کا دل ایسا گھلنے لگتا ہے کہ پھر جب وہ رات کو اٹھتا ہے تو اس کے آنسو بے اختیار نکلتے ہیں۔ ایسی حالت میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی آواز ایسے درد کے ساتھ اور ایسی ہوک کے ساتھ اٹھتی ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بارگاہ الٰہی میں مقبول نہ ہو۔

پس تبلیغ کا صبر سے گہرا تعلق ہے اور صبر بھی وہ صبر جو دعا پر منتج ہو جائے۔ جو دردناک دعاؤں میں تبدیل ہو جائے۔ تب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ تمہیں یوں محسوس ہوگا جیسے اچانک انقلاب آ گیا ہے تم حیران رہ جاؤ گے کہ یہ کیا واقعہ ہو گیا کل تک تو گالیاں دینے والے تھے آج ان کو کیا ہو گیا اور یہ واقعات پہلے بھی رونما ہوئے ہیں آج بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن ان کی اعلیٰ مثال کے طور پر مضمون کو مختصر کرتے ہوئے آخر پر قرآن کریم ایک ایسی بات بتاتا ہے جو ساری باتوں کی جامع ہے اور تمام نصیحتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا یُلَقّٰىهَآ

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۶﴾ کہ تم میں سے جو بھی صبر کرے گا وہ بھی یہی پھل پائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ کو یہ نتیجہ ملا ویسا کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ کون ہے؟ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کیونکہ آپؐ نے سب سے زیادہ صبر کا نمونہ دکھایا ہے ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ اس شخص کو کہتے ہیں جس نے صبر میں سب سے زیادہ حصہ پایا ہو۔ عام صبر کرنے والے بھی ہیں ان کو بھی خدا پھل سے محروم نہیں رکھے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم سیکھنا چاہتے ہو کہ صبر ہوتا کیا ہے، تبلیغ کس طرح کی جاتی ہے، دعوت الی اللہ کیا ہوتی ہے، عمل صالح کیا ہوتا ہے اور بدی کو حسن میں تبدیل کرنے کا مضمون کیا ہے؟ تو خلاصہ کلام یہ کہ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھ لو۔ وہ صرف صبر میں ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ نہیں ہیں بلکہ اس مضمون کی ہر شاخ میں ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ہیں۔ داعی الی اللہ کے لحاظ سے بھی دعوت کا سب سے بڑا حصہ آپؐ کو عطا کیا گیا عمل صالح کے لحاظ سے بھی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ بنتے ہیں، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے مضمون کے لحاظ سے بھی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ بنتے ہیں اور پھر وہ پھل پانے کے لحاظ سے کہ اچانک دشمن دوستوں میں تبدیل ہوئے اس لحاظ سے بھی آپؐ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ بنتے ہیں اور صبر کے اعلیٰ مظاہروں کے لحاظ سے بھی آپؐ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ بنتے ہیں۔

پس سیرت طیبہ جو تبلیغ کا طریق سکھاتی ہے اس طرف انگلی اٹھا کر بات ختم کر دی۔ کہتے ہیں:

ع نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے

(دیوان غالب)

وہی مضمون ہے۔ جس طرح شاعر تنگ آ کر کہتا ہے چلو میں بات ختم کروں، ایک ہی فقرہ میں ساری بات کہہ دوں۔ قرآن کریم نے بھی بہت ہی پیارے انداز میں ایک لفظ میں ساری بات ختم کر دی، ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ کہہ کر سارا معاملہ واضح اور روشن کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کا طریق یہ تھا کہ ہمیشہ تبلیغ کے نتیجہ میں جب آپؐ کو دکھ دیئے گئے تو نہ آپؐ تبلیغ سے باز آئے نہ دکھ دینے والوں کو بددعائیں دیں، نہ ان سے خوف کھایا اور نہ کسی پہلو سے بھی اپنا پیغام پہنچانے سے باز آئے۔ باوجود اس کے کہ سوسائٹی نے آپؐ کا انکار کیا، آپؐ سوسائٹی میں حسن پیدا کرتے چلے گئے اور یہ عمل جاری رہا یہاں تک کہ آپؐ کے ساتھ اور صبر والے شامل

ہو گئے اور دکھ اٹھانے والے ملنے شروع ہو گئے اور دکھ اٹھانے والوں کا یہ قافلہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ انقلاب آیا جس کے متعلق فرمایا کہ تم یہاں بیٹھ کے آج مڑ کر تاریخ کو دیکھتے ہو تو سمجھتے ہو اچانک ہو گیا اچانک نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیچھے تو بہت خون بہائے گئے تھے، امنگوں کے خون، جذبات کے خون، اپنے عزیزوں کے خون دینے سے دریغ نہیں کیا گیا تھا، اپنی تمام خواہشات ان اعلیٰ مقاصد کی بھینٹ چڑھا دی گئیں تھیں یہ صبر جب لمبا ہوا تب اللہ تعالیٰ کی قدرت نے وہ پھل لگایا جس کے متعلق فرماتا ہے۔ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ ۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہ عظیم الشان انقلاب جس شان سے ظاہر ہوا ہے کسی نبی کی تاریخ میں اس کا عشر عشیر بھی آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ حیرت انگیز انقلابات ہیں، شدید دشمنوں کا عظیم دوستوں میں تبدیل ہو جانے کی بکثرت مثالیں ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ مجاہدین کا ذکر تاریخ میں پڑھ کر لوگ آج بھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔

ایک دفعہ تین مجاہدین ایسی حالت میں زخمی پڑے تھے کہ زبانیں خشک ہو رہی تھیں، جان نکل رہی تھی لیکن وہاں پانی نہیں تھا۔ عکرمہؓ ان میں سے ایک تھے۔ جب پانی پلانے والا عکرمہؓ تک پہنچا تو عکرمہؓ کی نظر اپنے قریب ایک اور زخمی پر پڑ گئی۔ عکرمہؓ نے اشارہ کیا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ پھر میرے پاس آنا۔ پانی پلانے والا دوسرے زخمی کے پاس پہنچا تو اس کی نظر ایک اور زخمی پر پڑ گئی۔ چنانچہ اس نے بھی وہی اشارہ کیا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ پھر میرے پاس آنا۔ بعض لوگ کہتے ہیں تین تھے، بعض کہتے ہیں زیادہ تھے مگر وہ جتنے بھی تھے یہ حقیقت ہے کہ جب اس نے بھی انکار کیا کہ نہیں پہلے دوسرے کو پلاؤ اور وہ واپس عکرمہؓ کے پاس لوٹا تو عکرمہؓ بھی دم توڑ چکا تھا اور وہ دوسرا بھی دم توڑ چکا تھا اور تیسرا بھی دم توڑ چکا تھا۔ (اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ذکر حارث بن ھشام جلد اول صفحہ ۴۰۰) جن لوگوں میں ایک دوسرے کی خاطر جان فدا کرنے اور ایثار کے حیرت انگیز نمونے ظاہر ہوئے ہیں یہ وہی لوگ تھے جو مسلمانوں کی جانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ یہ وہی عکرمہ ہے جس نے احد کی خونریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور باقی جو اس کے ساتھی تھے یہ سارے وہ نومسلم تھے جنہوں نے مسلمانوں کو شدید نقصانات پہنچائے تھے اور اب ان کی کایا پلٹی ہے تو یہ حال ہو گیا ہے کہ اپنی جان جا رہی ہے، پیاس سے زبان خشک ہو رہی ہے، جب زخمی شدید گرمی میں ایک گھونٹ پانی کو ترس رہا ہوتا ہے اس وقت یہ خیال کر کے کہ ایک مسلمان بھائی اور بھی پیاس میں تڑپ رہا ہے خود پانی نہ پینا

بلکہ دوسرے کو موقع بہم پہنچانا کوئی معمولی قربانی نہیں ہے۔ عام پیاس کے وقت بھی جب پانی آتا ہے تو آپ کسی دن اس بات کو سوچیں کہ کس طرح دل چاہتا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر میں تو پانی پیئوں کسی اور کی پیاس بعد میں دیکھی جائے گی لیکن زخموں کی شدت میں عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یہ واقعہ گزر جانا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے مگر بکثرت ایسے واقعات ہوئے، اجتماعی طور پر بھی ہوئے اور انفرادی طور پر بھی۔

ثمامہ بن اثال قبیلہ بنو حنیفہ سے تھے اور آنحضرت ﷺ کے شدید دشمن تھے۔ جب داؤ لگتا تھا مسلمانوں کا قتل و غارت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دفعہ مسلمانوں کے قابو آ گئے۔ ان کو جب آنحضرت ﷺ کے حضور پیش کیا گیا تو آپؐ نے یہ حکم دیا کہ ان کو مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ آنحضور ﷺ نے اس سے پوچھا ثمامہ بتاؤ تم سے کیا سلوک کیا جائے۔ اس نے کہا کہ اگر تو آپ قتل کا حکم دیں تو ایک قاتل ایک خونی کے قتل کا حکم دیں گے اور آپؐ معاف کر دیں تو ایک محسن کی طرح حسن سلوک کر رہے ہوں گے اور اگر فدیہ چاہتے ہیں (امیر آدمی تھا) جتنا فدیہ لینا چاہیں میں دینے کے لئے تیار ہوں۔ رسول کریم ﷺ بغیر جواب دیئے واپس تشریف لے گئے۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا، تیسرے دن بھی یہی ہوا، پھر حضورؐ نے فرمایا اس کو کھول دو۔ آنحضور ﷺ کے اس ارشاد میں اگر آپ گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو حسن عمل کی ایک بڑی پیاری تصویر نظر آئے گی۔ کھلنے کے بعد پہلے تو وہ خاموشی سے باہر چلا گیا، غسل کیا، صاف ستھرا ہو کر آیا، کلمہ پڑھ کر مسجد میں داخل ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! آج کے دن سے پہلے میری نظر میں سب سے زیادہ مغضوب انسان آپؐ تھے اور آج آپؐ سے زیادہ محبوب آدمی میرے لئے اور کوئی نہیں۔ آج سے پہلے آپؐ کے دین سے مجھے شدید نفرت تھی مگر آج اس سے زیادہ اچھا دین مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اور اے اللہ کے رسول! آپؐ کا یہ شہر مجھے سب سے زیادہ حقیر اور ذلیل دکھائی دیا کرتا تھا اور آج یہ میری آنکھوں کا تارا بن گیا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر یہ لگتا ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الاغتسال اذا اسلم وربط الاسیر ایضا فی المسجد۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ذکر ثمامہ بن اثال جلد ۱)

پس فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ کے اس واقعہ کے پیچھے ایک اور حکمت کارفرما ہے۔ ایک انسان جس نے یہ فیصلہ کیا ہو کہ میں احسان کا جلوہ دکھاؤں اور ساری دنیا عش عش کر اٹھے

خواہ وہ احسان کتنا ہی بے محل ہو، آنحضرت ﷺ ویسے انسان نہیں تھے۔ آپؐ حسن عمل کے قائل تھے، آپؐ موقع اور محل دیکھا کرتے تھے، جہاں معافی فوری فائدہ پہنچاتی تھی وہاں فوری طور پر معاف کیا کرتے تھے، جہاں وقت درکار ہوتا تھا وہاں انتظار کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ میں یہ حکمت نظر آتی ہے کہ مسجد نبوی میں پانچ وقت نمازیں ہو رہی تھیں اور وہ ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ویسے تو اس کو تبلیغ کرنے کا وقت نہیں تھا تو آنحضور ﷺ کا منشائے مبارک یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین دن ہماری صحبت میں رہ جائے پھر دیکھیں گے کہ اس کا دل کس طرح بچ کر نکلتا ہے۔ بہر حال وہ چپ کر کے دیکھتا رہا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، کیا کرتے ہیں، دن کو بھی مسجد آباد ہو جاتی ہے اور رات کو بھی آنسوؤں سے تر کی جاتی ہے۔ یہ عجیب قسم کے خدا کے بندے ہیں۔ پس جب وہ مسلمانوں کے اثر سے مغلوب ہو گیا اور ذہنی طور پر قبول حق کے لئے تیار ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اسے آزاد کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا اس کے بند کھول دو اب یہ کہیں نہیں جا سکتا۔ مراد یہ تھی کہ یہ اب اسلام کے حسن کا اتنا گرویدہ ہو چکا ہے۔ اب یہ بندھن کھول بھی دو گے تب بھی دوبارہ غلام بن کر آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔

پس حسن عمل میں حکمت بھی ضروری ہے۔ حکمت کے ساتھ ایسا فعل کریں جو صرف ظاہر میں اچھا نظر نہ آئے بلکہ اس کے حسن میں گہرائی ہو۔ آنحضرت ﷺ کبھی بھی کسی بھی حکمت کا دامن چھوڑ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتے تھے ہر فیصلہ کے پیچھے حکمت کارفرما ہوتی۔ آپ کا ہر فیصلہ بڑا گہرا اور حکمت کا سرچشمہ دکھائی دیتا ہے۔ آپ کسی واقعہ پر ٹھہر کر غور کریں اور اس کے اندر تہہ تک غوطہ ماریں آپ کو موتی مل جائیں گے۔ آپ تلاش کریں آنحضور ﷺ کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر گہرے حکمت کے موتی پوشیدہ نہ ہوں۔

غرض یہ وہ طریق تبلیغ ہے جو قرآن کریم نے سکھایا اور یہ وہ نتائج ہیں جو قرآن کریم کے بیان کے مطابق لازماً نکلا کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی نکلے۔ ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے بارہا یہ نتیجے نکلتے دیکھے ہیں۔ ابھی چند ہفتے ہوئے لاہور میں اکٹھے بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ کسی گھر میں مدتوں سے ایک خاتون رہ رہی تھیں وہ احمدی نہیں ہوتی تھیں۔ مطالعہ بھی کرتی رہیں، بحثیں بھی کرتی رہیں۔ اب جب وہ احمدی ہوئیں تو اس وقت پھر اس آیت فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ کا جلوہ ہم نے دیکھا۔ چنانچہ وہ احمدی ہونے کے بعد کئی دن روتی رہیں کہ میں احمدی تو

ہوگئی ہوں مگر جو میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گالیاں دیا کرتی تھی میں بخشی بھی جاؤں گی یا نہیں مجھے یہ دکھ ہو رہا ہے۔ شدید بے قرار تھی ان کے گھر والوں نے تسلی دی، پیار کا سلوک کیا، تب بڑی مشکل سے ان کو اطمینان نصیب ہوا۔

پس یہ کوئی ایسی آیت نہیں جو گزشتہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہو۔ یہ تو ایک جاری وساری زندہ آیت ہے کیونکہ وہ لوگ جن کے ساتھ اس کا واسطہ تھا وہ مسلسل حسن سلوک کرتے رہے انہوں نے مخالفتیں بھی برداشت کیں، گالیاں بھی سنیں لیکن انہوں نے کوڑی کی بھی پرواہ نہیں کی، اپنے حسن سلوک میں کوئی کمی نہیں کی اور جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے صبر کو ہمیشہ میٹھے پھل لگتے ہیں، وہ میٹھے پھل بھی ہم نے دیکھے۔ یعنی شدید مخالفت کرنیوالے لوگ اچانک جاں نثار دوست بن گئے۔

غرض اس طریق پر اگر آپ داعی الی اللہ بنیں گے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر گھر میں انشاء اللہ ایک انقلاب پیدا ہونا شروع ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ ہر داعی الی اللہ کو میٹھے پھل عطا فرمائے گا اس لئے صبر کریں اور دعائیں کریں اور خدا کی راہ میں دکھ اٹھانے کے باوجود راضی رہیں اور اپنی شکائتیں لوگوں سے نہ کریں بلکہ اللہ سے کریں وہ کافی ہے۔ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ اس سے بہتر کوئی اور مولیٰ نہیں ہے۔ اس کا سہارا آپ کو مل جائے تو کسی اور سہارے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے اور پھر وہ آپ کا بہترین وکیل ہے آپ کے سب جھگڑے وہ اپنے فضل سے طے کروائے گا اور وہ سب سے زیادہ توکل کے لائق ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور توفیق سے ساری جماعت جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بہترین رنگ میں داعی الی اللہ بن جائے کیونکہ زمانہ کے کتنے تیور بگڑ چکے ہیں۔ خوفناک ہلاکتیں منہ پھاڑے تیزی کے ساتھ دنیا کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر یہ قومیں آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ آج نفسیاتی لحاظ سے اس سے بہتر اور کوئی وقت نہیں ہے کہ آپ ان کو حق کی طرف بلائیں اور ان کے لئے امن کا انتظام کریں۔ ورنہ اگر عالمی مصیبتیں ٹوٹیں تو پیشتر اس کے کہ ہم دنیا کو ہدایت دے سکیں، کہیں بدوں کے ساتھ نیک بھی پس کر نہ رہ جائیں کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس عذاب سے ڈرو جس میں بدوں کے ساتھ نیک بھی پھر پس جایا کرتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کریم کا کمال ہے کہ کوئی بھی صورت حال ہو اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے قرآن کریم بیان نہ

کرتا ہو۔ نہ چھوٹی بات چھوڑتا ہے نہ بڑی بات چھوڑتا ہے۔ ایسے استثنائی وقت بھی آجایا کرتے ہیں جب قومیں غفلت کے نتیجہ میں دنیا کو ہلاک ہونے دیتی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پھر بیچ میں تمہارا بھی حصہ ہوگا۔ عذاب تو ان کو مل رہا ہوگا لیکن آٹے کے ساتھ گھن پستا ہے۔ یہاں تو یہ فرما رہا ہے کہ گھن کے ساتھ آٹا پس جائے گا کیونکہ اکثریت تو گھن کی ہے۔

پس ایسے خوفناک وقت سے بچنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے تبلیغ کے کام کو تیز کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے آپ کو حوصلہ دے، صبر دے، دعاؤں کی توفیق دے، اپنے نشانوں کے ساتھ آپ پر دن کو بھی ظاہر ہو اور رات کو بھی۔ آپ کو یہ محسوس ہو کہ ایک زندہ خدا ہمارے ساتھ ہے، ایک طاقتور ہستی کے سایہ میں بڑھتا ہوا انسان خوف نہیں کھایا کرتا بلکہ دلیر ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں گھر میں بلی بھی شیر ہوتی ہے۔ آپ کا مقام تو اس سے بہت بلند ہے۔ خدا کی حفاظت گھر کی حفاظت سے کہیں زیادہ قوی اور مضبوط حفاظت ہے۔ یہ مقام اپنے دل میں پیدا کریں، اپنی عظمت کا احساس پیدا کریں، پھر دیکھیں کہ انشاء اللہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی داعی الی اللہ کسی سال پھل سے محروم رہے۔ ایک ایک، دو دو، تین تین، چار چار پھل آپ کو لگیں گے۔ جس طرح خدا تعالیٰ کے فرشتے مختلف پروں کے ہوتے ہیں، اسی طرح داعی الی اللہ بھی مختلف طاقتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کوئی دو دو، کوئی چار چار پروں والا ہوتا ہے اور کوئی آٹھ آٹھ پروں والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے پھر اس سے بھی بڑھا دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کی طاقتوں کے پروں میں اضافہ کرتا چلا جائے اور ہمیشہ اس کے فضل کے سایہ تلے آپ آگے سے آگے بڑھتے چلے جائیں۔

خطبہ ثانیہ کے دوران حضور نے فرمایا:

نمازیں جمع ہونگی۔ جمعہ کی تو خیر دو ہی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد میں عصر کی نماز دوگانہ پڑھوں گا۔ جو مسافر ہیں وہ میرے ساتھ سلام پھیریں اور جو مسافر نہیں ہیں وہ جب میں دونوں سلام پھیر لوں پھر کھڑے ہو کر اپنی بقیہ دو رکعتیں پوری کریں۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۱۵ رمئی ۱۹۸۳ء)